Jan
2026

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

دعوت کی لازوال تاثیر

”دعوت قوموں اور جماعتوں کے حق میں ”آبِ حیات“ ہے، جس نے اس کا کوئی جرعہ پی لیا، اس پر موت حرام ہے، اگر مسلمان اس دعوت کے علم بردار ہیں اور انھوں نے اپنے وجود کو اس دعوت کے وجود میں اس طرح گم کر دیا کہ ان کی زندگی اس دعوت کی زندگی کے مرادف ہوگئی تو فنا ان کے لیے محال اور بقا ان کے لیے مقدر ہے۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے　　　اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

(نشانِ راہ: ۱۷)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مركز الإمام أبي الحسن الندوي
دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

آیتِ دعوت کی وسعت، گہرائی اور گیرائی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

''قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دعوت کے طریق کار کے حدود مقرر نہیں کیے اور یہ کام داعی کی قوتِ تمیز اور عقل سلیم پر چھوڑ دیا ہے، اس بات کا فیصلہ کہ کب اور کس وقت کون سا طریق کار اختیار کیا جائے، اس کی طرف خود داعی کا ذوق اور عقیدہ رہنمائی کرے گا اور اس کی دینی فکر جو اس کے احساسات واعصاب پر حکمراں ہے وہ خود طریق کار کا انتخاب کرے گی، قرآن کریم نے صرف ایک وسیع حصار قائم کر دیا ہے جس کے اندر دعوتِ دین کی پوری روح (اسپرٹ) سما گئی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (النحل: ۱۲۵) (اے پیغمبر! لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو جو اس کے رستے سے بھٹک گیا تمہارا پروردگار اس سے خوب واقف ہے اور جو رستے پر چلنے والے ہیں انھیں بھی خوب جانتا ہے۔)

اس آیت کریمہ کی رو سے دونوں باتیں پوری طرح عیاں ہیں، ایک داعی الی اللہ کو کتنی آزادی ہے اور کس درجہ پابندی ہے، کہاں تک وہ جا سکتا ہے اور کس حد سے آگے قدم بڑھانا ممنوع ہے۔ جہاں تک دعوت کی وسعت اور داعی کی آزادی کا تعلق ہے، وہ اس تعبیر سے واضح ہے کہ ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ﴾ (بلاؤ اپنے رب کی راہ کی طرف) اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ایمان کی طرف دعوت دو، یا صحیح اور سچے عقیدہ کی طرف بلاؤ، یا نماز قائم کرنے کی دعوت دو، یا اخلاق حسنہ اختیار کرنے کی ترغیب دو، انسانیت کے احترام کی تلقین کرو۔ یہ سب نہیں کہا گیا مگر یہ تمام باتیں ﴿سَبِيلِ رَبِّكَ﴾ میں سمٹ آئی ہیں۔ اس لفظ نے فکر وعمل کے آفاق کھول دیئے ہیں، یہ آفاق بھی محدود نہیں ہیں، اس میں دوسرے ادیان سماوی، بشری ضروریات، انسانی زندگی میں پیش آنے والی حاجتیں سب داخل ہیں۔ ﴿ادْعُ﴾ (بلاؤ) کا لفظ بھی کس درجہ وسیع معانی پر حاوی ہے، اس میں نہ اس کی قید ہے کہ وعظ وتقریر کے ذریعے بلاؤ، نہ یہ کہ تحریر کے ذریعے دعوت دو، نہ یہ کہ وعظ وتلقین ہی کا ذریعہ اختیار کرو۔ یہ لفظ ﴿ادْعُ﴾ تمام معانی اپنے جلو میں رکھتا ہے اور حسب موقع داعی، دعوت کا فرض کبھی پند ونصائح سے، کبھی وعظ وتقریر سے اور کبھی تحریر اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے ادا کر سکتا ہے اور بلانے کا ہر وہ وسیلہ اختیار کر سکتا ہے جو مشروع ہو، مؤثر اور نافع ہو۔ پھر فرمایا: ﴿ادْعُ﴾ (اپنے رب کے راستے کی طرف) اس کے علاوہ کوئی تعبیر ممکن نہیں جس میں اتنی جامعیت اور وسعت، گہرائی اور گیرائی بیک وقت موجود ہو۔

''حکمت'' کا لفظ بہت ہی بلیغ اور بڑی وسعتوں کا حامل ہے، دوسری زبان میں اس کا ترجمہ آسان نہیں ہے، اسی طرح ''موعظت'' بھی وسیع معانی پر حاوی لفظ ہے، ''حسنہ'' کا لفظ بھی لامحدود معانی پر مشتمل ہے، قرآن نے اس آیت میں آزادی بھی دی ہے اور حد بندی بھی کی ہے، ایجاز واختصار بھی ہے اور بیان وشرح بھی۔''

(تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب: ۲۱-۲۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۸ | جنوری ۲۰۲۶ء – رجب المرجب ۱۴۴۷ھ | شمارہ: ۱

اسلام میں نرم مزاجی کی اہمیت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

”إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُوْنُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ“

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(بلاشبہ جس چیز میں نرمی شامل ہوتی ہے تو وہ اس کو زینت بخشتی ہے اور جس چیز سے نرمی نکال دی جاتی ہے تو وہ بے حیثیت ہو جاتی ہے۔)

(صحیح مسلم: ۲۰۹۴)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد مکی حسنی ندوی

محمد امین حسنی ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15 | E-Mail: markazulimam@gmail.com | سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

اہل فکرودعوت سے چند گذارشات (اداریہ)..................۳
بلال عبدالحی حسنی ندوی

تقویٰ کیا ہے؟..................۵
بلال عبدالحی حسنی ندوی

فسخ وتفریق کے مسائل..................۷
مفتی راشد حسین ندوی

ملک ہندوستان آمریت کی راہ پر..................۹
محمد مکی حسنی ندوی

الحاد کا طوفان: اسباب اور حل..................۱۱
محمد نجم الدین ندوی

مذہب اسلام کی امتیاز خصوصیات..................۱۳
محمد امین حسنی ندوی

تحریک ندوۃ العلماء کی جامعیت..................۱۶
زین العابدین ہاشمی ندوی

ہم ہیں تو خدا بھی ہے..................۱۷
محمد مصعب ندوی

دعوت کی اہمیت اور اس کے تقاضے..................۱۹
محمد ارمغان بدایونی ندوی

غفلت کا انجام

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ

اُس کو مل ہی نہیں سکتا کبھی توحید کا جام
جس کی نظروں سے ہے پوشیدہ رسالت کا مقام

یوں تو اس قادر وقیوم کی رحمت ہے عام
پر مقدر سے ملا کرتا ہے توحید کا جام

پا لے تو خیر امم ہو کے بھی ہے کالانعام
نہیں پختہ ترا ایمان، ابھی تک ہے خام

تجھ کو حاصل نہیں کیوں چین سکون وآرام
کچھ خبر ہے تری گمراہی کا ہے یہ انجام

اپنے آقا کی اطاعت سے جو غافل ہو غلام
کیوں ملے آپ ہی فرمایئے، اس کو انعام

ذلت وخواری ورسوائی سے تجھ کو کیا کام
سچ بتا، کیا تو نہیں ہائے محمد کا غلام

ہائے کیا بات ہے؟ سوچا ہے کبھی اس کو بھی
تجھ سے زیادہ نہیں دنیا میں ہے کوئی بدنام

حق سے افسوس نہیں تجھ کو محبت کچھ بھی
جھک کے اب شوق سے کرتا ہے تو باطل کو سلام

خاک میں تجھ کو ملایا ہے تیری غفلت نے
ہوش میں اب بھی نہ آیا، تو ہے حیرت کا مقام

بلال عبدالحی حسنی ندوی

اہل فکر ودعوت سے چند گذارشات

دنیا کے مذاہب میں اسلام کا ایک نمایاں امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں جو اعتدال ہے وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا، یہ اعتدال ہر جگہ نمایاں ہے، عقائد سے لے کر اعمال وکیفیات تک اور پھر وسائل تبلیغ ودعوت، اس کے طریقہ کار اور زندگی کے ہر شعبے میں یہ توازن بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظر آتا ہے، جو زندگی کے گلدستہ کو بڑی خوبصورتی سے سجاتا ہے اور ہمیشہ ساری دنیا کو خوشبوؤں سے مہکاتا رہا ہے۔

آخری امت پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ دعوتِ دین کا فریضہ انجام دیتی رہے، اس کے لیے جا بجا قرآن مجید میں ہدایات موجود ہیں، ایک آیت میں بڑی وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾(النحل: ۱۲۵)

(اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاتے رہیے اور اچھے طریقہ پر ان سے بحث کیجیے۔)

اللہ کے رسول ﷺ کی مبارک زندگی ان ہی قرآنی احکامات کی آئینہ دار بھی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو کھولنے والی بھی ہے، آپ ﷺ ہی شارح قرآن ہیں اور آپ ﷺ کی تفسیر وتشریح کی روشنی میں کی جانے والی اس کی تشریح وتفسیر ہی معتبر ہے اور یہ حکم قرآنی ہے، ارشاد ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾(النحل: ۴۴)

(اور ہم نے (کتاب) نصیحت آپ پر اس لیے اتاری تاکہ آپ لوگوں کے لیے ان چیزوں کو کھول دیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہیں اور شاید وہ غور کریں۔)

آیت شریفہ سے بھی اور آنحضور ﷺ کی سیرت سے بھی یہ بات واضح طریقہ پر سامنے آتی ہے کہ دعوت کے لیے اولین مرحلہ پر موعظہ حسنہ کو اختیار کیا گیا ہے، حکمت اس کی بنیاد میں شامل ہے، عام انسانی آبادی جو اوسط درجہ کا فہم رکھتی ہے، اس کی سطح کو دیکھ کر ہی بات کہی جائے، اس کے لیے بہت گہرائی میں جانا اکثر نقصان دہ ثابت ہوتا ہے، کچھ لوگ وہ بھی ہوتے ہیں جن کی عقلی سطح بہت نچلے درجہ پر ہوتی ہے، ایسے لوگوں کے لیے سادہ ایمان کافی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک باندی لائی گئی، آپ ﷺ نے اس سے خدا کے بارے میں پوچھا تو اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے ایمان کے لیے یہی کافی ہے۔ یہ اسلام کا توازن واعتدال ہے، کسی کو اس کی عقل سے زیادہ کا مکلّف نہیں بنایا جا سکتا اور نہ اس سے کسی ایسی گہرائی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے جو اس کی عقلی سطح سے ماوراء ہے، حدیث میں ہے کہ

”كلِّموا الناس علىٰ قدر عقولهم أتريدون أن يكذَّب الله ورسوله.“

(لوگوں سے ان کی عقل وفہم کے مطابق گفتگو کرو، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلا دیا جائے۔)

انسانوں میں بہ مشکل دس فیصد لوگ ایسے بھی ہیں جو بڑی گہرائیوں میں جاتے ہیں اور ان کی عقلی سطح بہت بلند ہوتی ہے، ان کو مطمئن کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہیں کہیں بال کی کھال نکالنے کی اور ان جزئیات تک پہنچنے کی جو عام لوگوں کی سطح سے بہت بلند ہوتی ہیں۔

قرآن مجید میں اسی لیے عام حکم دعوت کا ہے، اخلاق کے ساتھ، محبت کے ساتھ، اس کو"موعظہ حسنہ" کہا گیا ہے، ایک جگہ یہ بھی ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾(فصلت: ۳۳)

(اور اس سے اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور اچھے کام کیے اور کہا کہ میں تو فرماں بردار ہوں۔)

لیکن وہ طبقہ جو بلند ذہنی سطح رکھتا ہے اور بال کی کھال نکالنا اس کے مزاج میں داخل ہے، اس سے اس کی نفسیات کو سمجھ کر اس کی زبان میں اس کی عقلی سطح کو سامنے رکھ کر گفتگو کرنا ضروری ہے اور یہی "مجادلہ" ہے، لیکن اس میں بھی حکم ہے کہ وہ بہتر طریقہ پر ہو۔

انسانوں میں یہ تینوں طبقے ہیں، ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی رعایت کے ساتھ بات پیش کرے، اسّی فیصد گفتگو میں مجادلہ کی ضرورت نہیں ہوتی، دس فیصد لوگ انتہائی کمزور اور معمولی سطح کے ہوتے ہیں، صرف دس فیصد بلکہ اس سے بھی کم لوگ وہ ہوتے ہیں جن کو مطمئن کرنے کے لیے مجادلہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

طبقہ علماء کو اس کے لحاظ کی ضرورت ہے، نہ مجادلہ کی نفی کی جا سکتی ہے اور نہ اس کو غیر ضروری قرار دیا جا سکتا ہے، ایک طبقہ کو مطمئن کرنے کے لیے اس کی بڑی ضرورت ہے اور امت میں ایسے افراد ہونے چاہئیں جو یہ فریضہ انجام دیں، یقیناً ایسے لوگ قابل قدر ہیں، لیکن اسّی فیصد سے زیادہ ایسے علماء کی ضرورت ہے جو سادے طریقے پر دین کو پہنچا دیں اور بے ضرورت سوال وجواب میں نہ پڑیں۔ عام لوگوں کے لیے یہ چیزیں کبھی کبھی گمراہی کا سبب بن جاتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں دین کے کاموں کی قدردانی ہونی چاہیے، اس کو ہر طرح عصبیت سے پاک ہونا چاہیے، تبلیغ ودعوت کی مختلف صورتوں پر جو بہتر طریقے پر اختیار کی جا رہی ہوں خوش ہونا اخلاص کی علامت ہے، وہ کسی مدرسہ کی طرف سے ہو، کسی جماعت یا تحریک کی طرف سے ہو، اس میں کھینچا تانی کرنا اخلاص سے ہٹی ہوئی بات ہے۔

تیسری بات یہ کہ سوشل میڈیا کا اس دور میں اس قدر غلط استعمال (Missed use) ہو رہا ہے کہ اس سے عمومی طور پر انتشار پیدا ہوتا ہے، کم از کم طبقہ علماء کو، دین دار سمجھے جانے والے لوگوں کو اس کا لحاظ ہونا چاہیے کہ ان کی صلاحیتوں کا استعمال مثبت اور تعمیری کاموں میں ہو، خدانخواستہ اس کے بجائے اگر وہ صلاحیتیں تخریبی کاموں اور ایک دوسرے کو گرانے میں صرف ہوں گی تو سماج ایک کھنڈر کی شکل میں نظر آئے گا اور اس سے اعداء دین کی خواہشات پوری ہوں گی، ان کو کسی بم کے گرانے کی ضرورت نہیں، ہم خود ان کے آلہ کار بن کر سماج کو برباد کر لیں گے۔

ان حالات میں ہوش کے ناخن لینے کی ضرورت ہے، اختلافات اپنی جگہ لیکن بے ضرورت مخالفت اور ہٹ دھرمی انتہائی مضر ہے اور کم از کم میڈیا پر ضرورت اس کی ہے کہ امت کی ایک اچھی شبیہ سامنے آئے اور اسلام کے خوبصورت گلدستہ کی نگہبانی کا فریضہ انجام دیا جائے، بجائے اس کے کہ اس کے مختلف پھولوں میں عیب تلاش کیے جائیں اور ان کو توڑنے کی کوشش کی جائے، اگر ہمارے نوجوان علماء جو بڑی صلاحیتیں رکھتے ہیں پوری طرح اپنی ان صلاحیتوں کو دین کی تعمیر وترقی میں لگا دیں تو یقیناً ایک خوبصورت سماج وجود میں آ سکتا ہے جس کی آج ساری دنیا متلاشی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہر طرح مفادات سے بلند ہو کر اللہ کی رضا کے لیے، دین کے فائدہ کے لیے اپنی صلاحیتوں کو لگائیں، تو یقیناً دنیا بھی ہماری ہے اور آخرت کی کامیابی کا انحصار اسی پر ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم انسانیت کے اس خلا کو پر کریں اور آخری امت میں ہونے کے ناطے عالم انسانیت کے لیے ایک ایسا نمونہ پیش کریں جس سے جھلستی دنیا میں ایک بہار آ جائے۔

تقویٰ کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

جنت میں داخل کرنے والی دو اہم صفات:

"سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ؟ قَالَ: تَقْوَى اللّٰهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ."

(سنن الترمذی: ۲۱۳۵)

(اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں کو سب سے زیادہ جنت میں داخل کرنے والی چیز کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کا تقویٰ اور اچھے اخلاق۔)

حقیقت میں تقویٰ کا اصل مفہوم ہی جہنم سے اپنے کو بچانا ہے، اگر دیکھا جائے تو تقویٰ فی نفسہٖ جہنم سے بچنے کا راستہ ہے، یہ سب سے بڑی چیز ہے جو آدمی کو جہنم سے بچائے گی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جنت میں داخل کرے گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ تقویٰ کے اندر آدمی جس قدر بلند مراتب پر فائز ہوگا' اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے مرتبے کو اسی قدر بڑھاتا چلا جائے گا۔

اوپر حدیث میں بیان ہوا کہ تقویٰ کی صفت لوگوں کو سب سے زیادہ جنت میں داخل کرے گی، تقویٰ ایک جامع صفت ہے، تمام حرام کاموں سے بچنا، تمام مکروہات سے بچنا، یہاں تک کہ ان تمام کاموں سے بھی بچنا جو مباح ہیں لیکن ان میں کچھ نہ کچھ حرج ہے۔ حدیث میں بھی آتا ہے کہ جس چیز میں حرج نہیں ہے' اس کو اس چیز سے بچنے کے لیے چھوڑ دو جس میں حرج ہے۔ بعض اوقات آدمی بہت سے کام یہ کہتے ہوئے کر لیتا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے اور وہ اس میں تاویل کر لیتا ہے، لیکن حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو یہ مزاج بنائے گا تو وہ ان چیزوں میں پڑ جائے گا جن میں حرج ہے اور وہ یقیناً گناہوں میں پڑ جائے گا۔

تقویٰ کی زندگی گناہوں سے بچنے والی اور نیک اعمال کرنے والی زندگی ہے، عقائد سے لے کر عبادات و معاملات اور معاشرت تک ہمیں اسلام کا جو نظام دیا گیا ہے، جو پورا دستورِ زندگی ہے، وہ پورا کا پورا اختیار کیا جائے تو یہ اعلیٰ درجہ کا تقویٰ ہے۔ تقویٰ میں اس کی باطنی صفات بھی داخل ہیں، جس میں بنیادی طور پر اخلاص ضروری ہے، بعض مرتبہ لوگوں کو دھوکہ ہوتا ہے، کسی کو لوگ اللہ کا ولی سمجھتے ہیں، لیکن اگر وہ صرف لوگوں کے سامنے دکھاوا کر رہا ہے تو ظاہر ہے وہ منافق ہے اور اس نے تقویٰ کی حلاوت ہی نہیں چکھی۔

مذکورہ حدیث میں دوسری اہم صفت حسن اخلاق کی بیان ہوئی ہے، اس سلسلہ میں بعض مرتبہ بڑی غلط فہمی ہوتی ہے، لوگ سوچتے ہیں کہ حسن اخلاق اچھی چیز ہے تاہم شاید یہ قربِ الٰہی کا ذریعہ نہیں، اس کے مقابلہ میں لوگ قربِ الٰہی کا زیادہ مؤثر ذریعہ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی زیادہ سے زیادہ نمازیں پڑھے، زیادہ سے زیادہ روزے رکھے اور خوب تلاوت کرے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان چیزوں سے بہت زیادہ قریب ہوتا ہے جن میں ایک بندہ اپنے دوسرے بھائی کی فکر کرے، اخلاق برتے، ایثار سے کام لے، مشہور حدیث قدسی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ

اے بندے! میں بھوکا تھا لیکن تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، میں ننگا تھا لیکن تم نے مجھے کپڑے نہیں دیئے۔ بندہ عرض کرے گا کہ اے اللہ! تو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور تجھے ان چیزوں کی ضرورت کیسے ہو سکتی تھی؟ ارشاد ہوگا کہ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا، اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، فلاں بندہ محتاج تھا، اگر تو اسے کپڑے دیتا تو گویا مجھے دیتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام معرفت رب کا ایک بنیادی ذریعہ ہے، اسی لیے بعض لوگ یہ بات کہتے ہیں کہ عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے خدا ملتا ہے۔

محمود غزنوی کا ایک قصہ مشہور ہے، اس کی ایک بڑی ذہین باندی تھی جس کی وہ بہت قدر کرتا تھا اور اسے اپنے قریب رکھتا تھا، اس پر دربار میں بعض لوگوں کو حسد ہوا، جب محمود کو یہ اندازہ ہوا تو اس نے ایک مرتبہ دربار میں سب کو جمع کرنے کے بعد جائیدادوں کے بہت سے رقعے تیار کیے، اس نے یہ اعلان کیا کہ دربار میں جو جس چیز پر ہاتھ رکھ دے گا وہ اس کی ہو جائے گی، یہ سن کر سب لوگ دوڑے اور جس کے ہاتھ میں جو رقعہ آیا اس نے اٹھالیا، مگر اس ہنگامہ میں وہ باندی اپنی جگہ کھڑی رہی، محمود نے کہا کہ تم نے کسی رقعہ پر ہاتھ کیوں نہیں رکھا؟ وہ بولی کہ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ آپ جو بات کہہ رہے ہیں اس میں کوئی استثناء تو نہیں ہے؟ محمود نے کہا کہ کوئی استثناء نہیں ہے۔ وہ بولی: تو میں جس پر چاہوں اس پر ہاتھ رکھ دوں؟ اس نے کہا: ہاں، پھر وہ آئی اور اس نے محمود ہی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی کہ جب بادشاہ ہمارا تو سب کچھ ہمارا۔ یہ جواب سن کر محمود نے لوگوں کو بتایا کہ یہی وہ راز ہے جس کے سبب میں اس کو قریب کرتا ہوں، گویا اللہ نے اس کو جو عقل دی ہے وہ ہر ایک کو حاصل نہیں۔

ٹھیک اسی طرح جب اللہ کسی کا ہو گیا تو ظاہر ہے جنت بھی اس کی طے ہے، اردو کا ایک مشہور شعر ہے ؎

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت ہزار مے خانے

یعنی ان چند پیمانوں کی کیا قیمت ہے؟! اگر نہ ملے تو نہ ملے لیکن اگر "ان کی نگاہ" سلامت ہے، وہ محبت اور توجہ فرماتے ہیں تو پیمانوں کی کوئی قیمت نہیں، پھر تو ہزاروں میخانے قدموں میں ہوں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب اللہ سے تعلق مضبوط ہو گیا اور اللہ بندہ سے محبت کرنے لگا تو سارا کام گویا آسان ہو گیا، دنیا میں چاہے کتنے ہی سخت حالات آئیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اگر آدمی اللہ سے سچا تعلق پیدا کر لے، وہ تعلق جو حقیقی ہوتا ہے، جو دل کا ہوتا ہے تو اس کے لیے کوئی مشکل ' مشکل نہیں رہ جاتی، صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیاں اس بات کی بہترین آئینہ دار ہیں، وہ یہ بات بالکل نہیں سوچتے تھے کہ کل آنے والے مسائل کو ہم کیسے برداشت کریں گے، ان کا اللہ سے تعلق ایسا مضبوط تھا کہ وہ بڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔

حضرت موسیٰ بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ قیروان فتح کرنے گئے، وہاں انھوں نے ایک جگہ جنگل میں خیمہ زن ہونے کا ارادہ کیا تو وہاں کے مقامی لوگوں نے منع کیا کہ یہ جگہ خطرہ کی ہے اور یہاں بہت سے جنگلی جانور بھی ہیں، لیکن وہ بولے کہ لشکر کے خیمہ زن ہونے کے لیے یہی جگہ موزوں ہے اور ہم اپنے خیمے یہیں لگائیں گے، پھر وہ بولے کہ ہم اللہ کے نبی ﷺ کے قاصد ہیں اور ہم اللہ کے دین کو لے کر آگے بڑھے ہیں، ہمیں کسی دوسری جگہ جا کر خیمہ لگانے کی ضرورت نہیں بلکہ ان جانوروں کو یہاں سے جانا ہوگا جو کسی کام کے نہیں، پھر انھوں نے کسی صحابی سے جنگل میں یہ اعلان کرنے کو کہا کہ اتنا وقت تمہارے پاس ہے، اس کے اندر تم یہاں سے چلے جاؤ، اگر نہیں گئے تو تمہاری خیر نہیں۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ اس کے بعد لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک شیرنی اپنے بچے کو دبائے لیے چلی جارہی ہے اور پورا جنگل خالی ہو گیا۔

ظاہر ہے سب کچھ اللہ کا ہے، سارے جانور اس کے اور ساری طاقتیں بھی اسی کی، آج جو یہ طاقتیں ہم پر آزمائی جاتی ہیں وہ اس لیے آزمائی جاتی ہیں کہ ہم نے اللہ کی حقیقی طاقت کا سہارا نہیں لیا، ہم نے اللہ سے اپنا تعلق مضبوط نہیں کیا، آج ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نہ نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور نہ جماعت کا اہتمام اور اگر کرتے بھی ہیں تو انتہائی بے دلی سے، حدیث میں آتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں بظاہر مسجدیں آباد ہوں گی لیکن ان میں اگر خشوع وخضوع رکھنے والے تلاش کیے جائیں گے تو ایسے لوگ نظر نہیں آئیں گے۔

فسخ وتفریق کے مسائل

مفتی راشد حسین ندوی

تفریق کا نواں سبب

شوہر کا کسی خطرناک مرض کا شکار ہونا:

امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نزدیک جنون یا کسی خطرناک مرض جیسے کوڑھ، سفید داغ وغیرہ کی وجہ سے قاضی نکاح فسخ نہیں کرے گا لیکن امام محمد کے نزدیک اگر اس طرح کا کوئی خطرناک مرض شوہر میں ہو تو قاضی نکاح فسخ کردے گا، ائمہ ثلاثہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ عملاً دارالقضاؤں میں اسی پر عمل ہے، خود شامی میں ذکر ہے کہ اگر قاضی فسخ کا قائل ہو اور فسخ کا فیصلہ کردے تو صحیح مانا جائے گا۔

(شامی:۳/۵۰۱، باب العنین)

علامہ طحطاوی نے ہر ایسے عیب اور مرض کو اس میں شامل کیا ہے جس کے ہوتے عورت کے لیے شوہر کے ساتھ رہنا ممکن نہ ہو:

”وألحق به القهستاني كل عيب لا يمكنها المقام معه إلا بضرر ونقله المؤلف في شرح الملتقىٰ.“

(طحطاوی آخر باب العنین: ۲/۲۱۳)

اسی لیے عصر حاضر کے علماء نے ایڈز جیسے مرض کا شمار بھی اسی میں کیا ہے۔ (کتاب النوازل:۵/۲۸۱)

بلکہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے سوزاک اور آتشک جیسے امراض کو بھی اسی میں شمار کیا ہے۔ (طلاق وتفریق:۶۱)

تفریق کا دسواں سبب

شوہر کا تکلیف دہ مار پیٹ کرنا:

جب بیوی کے اندر کوئی خلافِ شرع چیز یا گندی چیز پائی جائے یا شوہر کی نافرمانی اس کی عادت بن جائے اور وعظ ونصیحت کرنے کے باوجود وہ باز نہ آئے تو آخری چارہ کے طور پر بطور تنبیہ ہلکی ضرب لگانے کی شوہروں کو شریعت نے اجازت دی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾(النساء: ٣٤)

(اور جن بیویوں کے نشوز (نافرمانی) کا تم کو ڈر ہے تو ان کو سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں ان سے علاحدگی اختیار کرو اور مارو، پس جب تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو۔)

آیت کریمہ نے صاف کردیا ہے کہ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ان کو سمجھایا جائے، دوسرا یہ ہے کہ خواب گاہ الگ کردی جائے، پھر بھی باز نہ آئیں تو ضرب کی اجازت ہے لیکن حدیث شریف میں بتایا گیا کہ یہ ضرب غیر مبرح ہونا چاہیے۔

(مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ: ١٢١٨)

یعنی ایسی ضرب نہ ہونی چاہیے جس کے اثرات جسم پر باقی رہ جائیں۔ (احکام القرآن للجصاص)

شریعت نے تکلیف دہ مار پیٹ کرنے پر پابندی لگائی ہے۔

لیکن اگر کوئی شوہر تکلیف دہ مار پیٹ کرتا ہو تو احناف کے نزدیک عورت معاملہ کو قاضی کے پاس لے جائے گی اور تعزیر کا مطالبہ کرے گی، لیکن امام مالک کے نزدیک وہ قاضی سے فسخ نکاح کا مطالبہ بھی کرسکتی ہے اور دارالقضاؤں میں اب اسی پر عمل ہے، مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

”حالات کے پیش نظر اگر مار پیٹ حد ضرر تک ہو اور عورت تنگ ہوکر تفریق کا مطالبہ کرے اور حنفی قاضی کو فریقین سے تحقیق حال کے بعد شواہد وثبوت سے ظن غالب ہوجائے کہ عورت اپنے دعویٰ

میں سچی ہے، تو وہ امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق ان کی تصریحات کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہے۔" (کتاب الفسخ والتفریق: ۱۴۸)

اور امام مالک کے مسلک میں ہے کہ قاضی کے پاس جب عورت اپنا معاملہ دائر کرے تو قاضی پہلے مرحلہ میں شوہر کو سمجھائے کہ اس طرح کی مار پیٹ بند کرے ورنہ دونوں کے درمیان علیحدگی ہوسکتی ہے، اگر اس سے فائدہ ہوجائے تو ٹھیک ہے، لیکن اگر عورت دوبارہ قاضی کے پاس یہی شکایت لے کر آئے اور بتائے کہ شوہر مار پیٹ سے باز نہیں آیا اور معاملہ حل نہیں ہوا ہے تو قاضی دو حکم مقرر کرے گا جو اصلاح کی کوشش کریں گے اور اگر اصلاح نہ ہوسکے تو اگر زیادتی شوہر کی طرف سے ہو تو دونوں حکم شوہر کی طرف سے زوجہ کو بلا معاوضہ طلاق دیں گے اور اگر زیادتی بیوی کی طرف سے ہو تو حکمین دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز کرسکتے ہیں:

(۱) پہلی یہ کہ حکمین شوہر پر بیوی کے ساتھ انصاف کرنے اور حسن معاشرت کرنے میں اعتماد کریں۔

(۲) دوسری یہ کہ عورت سے معاوضہ لے کر دونوں کے درمیان تفریق کردیں۔ (الاحوال الشخصیۃ: ۳۶۲-۳۶۳)

تفریق کا گیارھواں سبب

میاں بیوی میں شقاق ہونا:

شقاق کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ دو آدمیوں میں عداوت نے آخری شکل اختیار کرلی ہو، یہاں تک کہ دونوں میں سے ایک شخص ایک شق یعنی سرے پر ہو اور دوسرا دوسری شق پر ہو، جب میاں بیوی میں شوہر کی بے جا مار پیٹ یا خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے اس طرح کا شقاق پیدا ہوجائے تو قرآن نے اس کے متعلق یہ حکم دیا ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا...الآية﴾ (النساء: ۳۵)

(اگر تم کو میاں بیوی میں شقاق کا اندیشہ ہو تو ایک حکم (منصف، پنچ) مرد کے خاندان کا اور ایک حکم بیوی کے خاندان کا مقرر کرو، اگر دونوں حکم اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔)

پھر حکم کے اختیارات کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک اگر حکمین کے نزدیک طلاق ہی مسئلہ کا حل ہو تو حکمین طلاق دے سکتے ہیں، لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ اختیار ان کو اسی وقت ہوسکتا ہے جب شوہر ان کو طلاق دینے کا وکیل بنادے۔

اس مسئلہ میں بھی دار القضاؤں میں امام مالک کے مسلک پر عمل ہے، چنانچہ دار القضاء میں اگر اس طرح کا معاملہ آئے تو قاضی حکمین کے ذریعہ طلاق دلاسکتا ہے، البتہ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ جب دوسرے امام کا مسلک اختیار کیا جائے تو اس امام کی تمام شرائط کا لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا اس مسئلہ میں بھی مالکیہ کی شرائط ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا اور وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

ان کے نزدیک حکمین میں چار چیزیں شرط ہیں:

(۱) ان کا مرد ہونا۔

(۲) عادل ہونا۔

(۳) سمجھ بوجھ رکھنے والا ہونا۔

(۴) متعلقہ مسائل سے واقف ہونا۔

اسی وجہ سے عورت، بچہ، مجنون، کافر، فاسق اور ناسمجھ کو حکم بنانا جائز نہیں ہے، اسی طرح جس کو نشوز اور صلح کے احکام کا علم نہ ہو، اس کو بھی حکم بنانا ناجائز ہے۔

اگر میاں بیوی کے خاندان میں ان شرائط پر اترنے والے موجود ہوں تو انھی کو حکم بنانا واجب ہوگا اور استحبابی درجہ میں یہ ہے کہ حکمین زوجین کے پڑوسی ہوں اور یہ ضروری نہیں ہے کہ حکمین کے فیصلہ سے زوجین راضی ہوں۔ (الاحوال الشخصیۃ: ۳۶۲-۳۶۳، کتاب الفسخ والتفریق: ۱۵۲-۱۵۷)

ملک ہندوستان آمریت کی راہ پر

سید محمد مکی حسنی ندوی

ہندوستان میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے، 1950ء میں نافذ ہونے والا آئین، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات، کثیر الجماعتی سیاست، آزاد عدلیہ اور متنوع سماجی ڈھانچہ اس دعویٰ کی بنیاد فراہم کرتے ہیں، تاہم حالیہ برسوں میں اندرونِ ملک اور عالمی سطح پر یہ سوال شدت اختیار کر گیا ہے کہ کیا ہندوستان اپنی جمہوری روایت کو پوری قوت کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہے یا آمریت کے تدریجی اور بالواسطہ رجحانات غالب آ رہے ہیں۔

جمہوریت کا بنیادی اصول عوامی حاکمیت ہے، اس میں اقتدار کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں اور ریاستی طاقت آئین، قانون اور قانون ساز اداروں پر منحصر رہتی ہے۔ جمہوریت میں اظہارِ رائے کی آزادی، اقلیتوں کے حقوق، اختیارات کی تقسیم، شفاف انتخابات اور قیادت کا احتساب ناگزیر عناصر ہیں۔ اس کے برعکس آمریت میں طاقت چند افراد یا اداروں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے، اختلافِ رائے کو دبایا جاتا ہے اور قانون کو حکمرانوں کے مفاد کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید دنیا میں آمریت اکثر کھلی فوجی حکمرانی کی صورت میں نہیں بلکہ "منتخب آمریت" (Elected Dictatorship) یا "ہائبرڈ نظام" (Hybrid System) کی شکل میں سامنے آتی ہے، جہاں انتخابات تو ہوتے ہیں مگر لامحالہ کامیابی اسی ایک سیاسی جماعت کی ہوتی ہے جو حکمرانی میں ہوتی ہے اور جمہوری روح کمزور ہوتی جاتی ہے۔

ہندوستانی آئین جمہوری، سیکولر اور وفاقی اقدار کا حامل ہے۔ بنیادی حقوق، پارلیمانی نظام، آزاد عدلیہ اور ریاستوں کو دیے گئے اختیارات جمہوریت کے ضامن ہیں۔ آئین نہ صرف ریاستی طاقت کو محدود رکھتا ہے بلکہ شہریوں کو اظہار، مذہب، اجتماع اور مساوات جیسے حقوق بھی فراہم کرتا ہے، تاہم آئین کی موجودگی بذاتِ خود جمہوریت کی ضمانت نہیں۔ اصل سوال آئین پر عمل درآمد اور اس کی روح کے احترام کا ہے۔ جب آئینی ادارے حکومت کے مفاد کے مطابق چلنے لگیں اور کمزور پڑ جائیں یا قوانین کا اطلاق منتخب جماعت کی مرضی سے ہو تو جمہوریت رسمی ڈھانچے تک محدود ہو جاتی ہے۔

پارلیمنٹ جمہوریت کا مرکز ہوتی ہے جہاں عوامی نمائندے قانون سازی اور حکومت کا احتساب کرتے ہیں۔ ہندوستان میں پارلیمنٹ فعال ہے مگر حالیہ برسوں میں یہ تاثر مضبوط ہوا ہے کہ اہم قوانین عجلت میں، محدود بحث کے ساتھ اور بعض اوقات پارلیمانی کمیٹیوں کے مؤثر جائزہ کے بغیر منظور کیے جا رہے ہیں۔ اپوزیشن کے کردار کو محدود کرنا، بحث کے لیے وقت کم کرنا اور اکثریت کے زور پر فیصلے مسلط کرنا جمہوری روایت کو کمزور کرتا ہے۔ اگر پارلیمنٹ محض حکومتی فیصلوں کی توثیق تک محدود ہو جائے تو آمریت کا نظام مضبوط ہوتا جاتا ہے۔

ہندوستان میں باقاعدگی سے انتخابات کا انعقاد جمہوریت کی ایک بڑی علامت ہے۔ الیکشن کمیشن ایک مضبوط ادارہ سمجھا جاتا رہا ہے اور ووٹرز کی بڑی تعداد میں شرکت عوامی شعور کی عکاسی کرتی ہے۔ تاہم انتخابی مہمات میں دولت اور طاقت کے بڑھتے ہوئے کردار، الیکشن کمشنر کو اپنی مرضی سے اس اعلیٰ منصب پر فائز کرنا، الیکشن کمیشن کی مدد سے فرضی ووٹروں کو شامل کرنا، میڈیا کے غیر متوازن استعمال، نفرت انگیز بیانیے اور سرکاری وسائل کے مبینہ غلط استعمال نے انتخابی شفافیت پر سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسی جماعتوں کے اندر جمہوریت کی کمی، قیادت کا ارتکاز اور نظریاتی سیاست کے بجائے شخصی سیاست کا فروغ بھی جمہوری کمزوریوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

آزاد میڈیا جمہوریت کی آنکھ، کان اور زبان ہوتا ہے۔ ہندوستان میں میڈیا کا دائرہ وسیع ہے مگر اس وقت میدان صحافت پر حکومتی اشخاص کا قابض ہونا، خود سنسرشپ، حکومتی بیانیے کی بالادستی اور اختلافی آوازوں کے خلاف قانونی اداروں کے ذریعہ کارروائیوں کے الزامات سامنے آئے ہیں۔ صحافیوں، دانشوروں اور سماجی کارکنوں پر مقدمات، گرفتاریوں یا ہراسانی سے اظہارِ رائے کی آزادی متاثر ہوتی ہے۔ سوشل میڈیا نے عوام کو آواز دی ہے مگر اس کے ساتھ نگرانی، اپنے آئی ٹی سیل (IT Cell) کے ذریعہ مخالفین کی آواز کو دبانا، غلط معلومات اور نفرت انگیزی کے واقعات حد درجہ بڑھے ہیں جن کو

روکنے سے آزادی، شفافیت اور انصاف میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

عدلیہ جمہوریت کا محافظ سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستانی عدلیہ نے اپنی روشن ماضی میں کئی مواقع پر آئینی حقوق کا دفاع کیا ہے۔ تاہم کچھ فسطائی طاقتوں کے زیر اثر انصاف میں تاخیر اور بعض حساس معاملات میں عدالتی خاموشی یا تاخیر عوامی اعتماد کو متاثر بھی کرتی ہے۔ ملک میں فسطائی طبقہ قانون سے بالاتر نظر آتا ہے اور خلاف معمول ججوں کو مقدمہ سے ہٹانا، ان کا تبادلہ یہاں تک کہ زیادہ نقصان محسوس کرنے پر قتل بھی کر دینے کے واقعات پیش آئے ہیں۔ ان تمام واقعات سے کمزور طبقات کو فوری انصاف نہیں ملتا اور قانون کی بالادستی کمزور پڑتی جاتی ہے جو آمریت کے رجحانات کو تقویت دیتی ہے۔

ہندوستان ایک وفاقی ریاست ہے جہاں مرکز اور ریاستوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم جمہوری توازن کے لیے ضروری ہے۔ حالیہ برسوں میں مرکز کے اختیارات میں اضافہ اور ریاستی حکومتوں کے دائرۂ اختیار میں کمی کے خدشات ظاہر کیے گئے ہیں۔ گورنروں کے کردار، مالی وسائل کی تقسیم اور مرکز کی پالیسیوں کے نفاذ میں ریاستوں کی رائے کو نظر انداز کرنا وفاقی روح کو متاثر کرتا ہے۔ ہر الیکشن سے پہلے (One Nation, One Election) کی پیشکش ہوتی ہے، کہنے کو تو یہ انتخابات کا خرچ کم کرنے کی پیشکش تھی جس کا بل پچھلے سال دسمبر میں پاس بھی ہوا ہے، اس ون نیشن ون الیکشن میں جمہوریت کا بھی وہی انجام ہوگا جو چنڈی گڑھ میں میئر کے ساتھ ہوا اور پھر بعد میں سپریم کورٹ کو یہ کہنا پڑا کہ ''یہ جمہوریت کا قتل اور جمہوریت کا مذاق ہے''۔ ان تمام حکومتی اقدامات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وفاقیت کے بغیر جمہوریت کمزور اور آمریت مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔

جمہوریت کی پہچان یہ ہے کہ اکثریت کی حکمرانی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے ساتھ ہو۔ ہندوستان کی سماجی ساخت کثیر مذہبی، لسانی اور ثقافتی ہے۔ حالیہ برسوں میں یہ دیکھنے کو ملا ہے کہ اقلیتوں کی تباہی پر کچھ فسطائی طاقتیں کام کر رہی ہیں اور حکومت میں بھی ان کا اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا ہے، اقلیتوں کے گھروں کو تباہ کرنا، یہاں تک کہ ان کے وجود کو خطرہ میں ڈالنا ان کا اصل مشن ہے۔ مذہبی، لسانی اور سماجی اقلیتوں کے حوالہ سے عدم تحفظ کے احساس، امتیازی سلوک اور نفرت انگیز بیانیے جمہوریت کی بنیادیں کمزور کرتی ہیں اور آمریت کو مضبوط کرتی ہے۔

جمہوریت صرف سیاسی حقوق تک محدود نہیں بلکہ معاشی انصاف سے بھی جڑی ہے۔ غربت، بے روزگاری، مہنگائی اور عدم مساوات جیسے مسائل عوامی اعتماد کو متاثر کرتے ہیں۔ اس وقت ہندوستانی حکومت کا طرز عمل چند نامزد کاروباریوں کو فائدہ پہنچا رہا ہے اور عوام میں کچھ کے لیے راشن کی بھیک ہے لیکن افسوس کہ باقی کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ چند کاروباری بینک سے چھوٹ حاصل کرتے ہیں اور عوام کے لیے اس بینک کے قرض پر سود پر سود اور کسی طرح کی چھوٹ نہیں جس کی بنا پر متعدد لوگ خودکشی کی راہ اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ جہاں ان بڑے کاروباریوں پر نظر کرم ہے، عوام کو کسی کاروبار میں کوئی مدد نہیں، نوکریوں کی موجودگی کے باوجود کوئی بھرتی نہیں سوائے بہلاوے اور ٹہلاوے کے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کاروباریوں کے ساتھ ان فسطائی طاقتوں کا کچھ معاہدہ ہے اور ملک فروشی کی ایک مہم ہے۔ جب معاشی پالیسیاں چند طبقات کو فائدہ پہنچائیں اور اکثریت کو نظر انداز کیا جائے تو جمہوریت کمزور پڑتی ہے اور آمرانہ طرز حکمرانی کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اس وقت ایک ایسے مرحلے سے گزر رہا ہے جہاں جمہوری ڈھانچے تو موجود ہیں مگر ان کی روح کو مختلف چیلنجز لاحق ہیں۔ یہ صورتِ حال ''ہائبرڈ نظام'' سے مشابہ نظر آتی ہے جس میں انتخابات اور آئین موجود ہوتے ہیں مگر اختیارات کا ارتکاز، ادارہ جاتی دباؤ اور شہری آزادیوں میں کمی آمریت کی راہ ہموار کرتی ہے۔

ہندوستان کے موجودہ تناظر میں یہ کہنا درست ہوگا کہ ملک میں نہ تو کھلی آمریت قائم ہے اور نہ ہی مکمل و مضبوط جمہوریت۔ ہندوستان ایک ایسی جمہوریت ہے جو دباؤ، کمزوریوں اور تضادات کا شکار ہے۔ اگر آئین کی بالادستی، اداروں کی خودمختاری، اظہارِ رائے کی آزادی، اقلیتوں کے حقوق اور وفاقی توازن کو مؤثر طور پر محفوظ نہ کیا گیا تو جمہوریت محض ایک آئینی اصطلاح بن کر رہ جانے کا خدشہ ہے۔ حقیقی جمہوریت کے لیے ضروری ہے کہ اقتدار عوام کے مفاد اور قانون کے تابع رہے، نہ کہ طاقت اور اکثریت کے زور پر۔

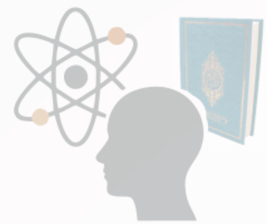

الحاد کا طوفان: اسباب اور حل

محمد نجم الدین الرحیمی ندوی

دنیا کے ہر مذہب میں تصورِ الٰہ پایا جاتا ہے، اس کا یقین واقرار فکری و مذہبی طور پر ایک بنیادی اساس ہے، دورِ جدید کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ مذہب پر فکری حملہ اور مذہبی احکام سے عملی انحراف عروج پر ہے، اس وقت کے مختلف النوع فتنوں میں ایک خطرناک اور تیزی سے بڑھنے والا فتنہ الحاد و دہریت ہے، دراصل اس فتنہ کا دروازہ کم فہم مدعیان علم وعقل نے اپنے آپ کو عقل کل مان کر کھولا ہے، اس کے نتیجہ میں ہر کس و ناکس نے اپنی عقل وفہم کے دائرہ میں ہی رہ کر خالق وباری تعالیٰ کے بارے میں سوچنا سمجھنا شروع کر دیا اور لاعلمیت، ہٹ دھرمی، نفسانی خواہش میں رکاوٹ یا ذہنی بیماری کے سبب وجود باری تعالیٰ کا انکار کر بیٹھے، پھر یہیں سے فکری خطرات اور الحاد کی آندھی آگے بڑھنی شروع ہوئی اور اس نے انسانی سماج کو اپنے لپیٹ میں لے کر وجود باری تعالیٰ پر اعتماد وایمان میں رخنہ پیدا کرنا چاہا۔

یہ مسلم حقیقت ہے کہ اگر ایمان واعتقاد صحیح ہو، یقین مضبوط ہو اور دین کا علم حاصل ہو تو ہوا جس قدر بھی تند وتیز ہو، ایک صاحب ایمان کا چراغ جلے گا اور ''وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے'' کا مصداق بن کر رہے گا۔ حدیث پاک میں ہے: ''لَا تَضُرُّكَ الْفِتْنَةُ مَا عَرَفْتَ دِيْنَكَ، إِنَّمَا الْفِتْنَةُ إِذَا اشْتَبَهَ عَلَيْكَ الْحَقُّ وَالْبَاطِلُ'' (جب تک تمہیں دین ومذہب کی آگہی ومعرفت حاصل ہے، فتنہ تمہیں (کسی طرح بھی) نقصان نہیں پہنچائے گا، فتنہ اس جگہ نقصان پہنچاتا ہے جہاں تمہارے اوپر حق وباطل اور خیر وشر مشتبہ ہو جائے۔) (ابن ابی شیبہ: ۳۸۴۴۷)

اقوام عالم کی مذہبی تاریخ میں یہ تصور موجود ہے اور اسلام تو صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ انسانی معاشرہ کا آغاز توحید الٰہی کے تصور اور عقیدہ سے ہوا ہے لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ انسانی معاشرہ میں شرک والحاد ایک نقطۂ نظر کی شکل میں متبادل طور پر فکری تاریخ میں موجود رہا ہے، انبیائی تعلیمات پر یقین کے حاملین مذاہب میں بھی الحاد نے جگہ پائی جیسے نصرانیت و یہودیت میں اسمائے الٰہی میں ایمان کے حوالے سے الحاد پایا جاتا ہے، جنھوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کہا یا تین الٰہ میں ایک الٰہ کہا، اسی طرح ابن اللہ کہا، یا جن لوگوں نے حلولیت کا عقیدہ گڑھا، نصاریٰ کے ان تمام عقائد کی بہت سی آیاتِ قرآنی میں تردید ہے اور شبہات واعتراضات کے تشفی بخش جوابات بھی ہیں۔

ایک مغربی ماہر الٰہیات Wilhelm Schmidt نے اپنی کتاب ''The Origin of the Idea of God'' میں اپنی علمی زندگی کی زائد از چہل سالہ طویل تحقیق پیش کردی ہے، اس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ''میں تحقیق کے نتیجہ میں یہاں پر پہنچا کہ انسان کے ابتدائی معاشرہ میں اس کا مذہب توحید تھا، ابتدائی دور کا انسان ایک تخلیق کار پر ایمان واعتقاد رکھتا تھا جو رحم وکرم اور احسان کی صفتوں سے ذی صفت خالق تھا، اس ابتدائی انسانی معاشرہ کا انسان ایک معبود کو اس کائنات کا تخلیق کار اور زمین وآسمانوں کا مطلق حاکم جانتا تھا، اس کے بعد آنے والے انسانوں نے ایک سے زیادہ معبود بنا کر عبادت شروع کی۔''

یہ ایک غیر معمولی اظہار ہے، اس میں حق کی صدائے بازگشت ہے، قرآن حکیم میں انسان کے اس ابتدائی توحیدی معاشرہ کا ذکر ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ، وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (البقرة: ۲۱۳)

(سب لوگ ابتدا میں ایک دین پر تھے پھر ان میں باہم اختلاف

واقع ہوا تو اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو خوش خبری دیتے ہیں اور ڈراتے ہیں اور اللہ نے ان نبیوں کے ساتھ سچی کتاب بھی نازل کی تا کہ اللہ ان لوگوں کے مابین ان باتوں کا فیصلہ کردے جن میں وہ اختلاف کررہے ہیں مگر اس میں اختلاف صرف ان لوگوں نے ہی کیا جنہیں وہ کتاب مل چکی تھی اور روشن ہدایات پالینے کے بعد بھی آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اپنے حکم سے حق دکھایا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا، اللہ جسے چاہے راہِ راست دکھادیتا ہے۔)

ایک ملحد و منکر خدا اولین مرحلہ میں وجودِ باری تعالیٰ کا انکار کرتا ہے، انکارِ خدا کا گروہ جو دورِ جدید میں سامنے آیا، اس میں اکثر کے تانے بانے اشتراکی فلسفہ سے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ قلوبِ انسانی فطرۃً باری تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرتے ہیں اور منکرین کا دل اس کے وجود کا یقین واعتماد رکھتا ہے، قرآن کی شہادت ہے:

﴿وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْماً وَعُلُوّاً﴾ (النمل: ١٤) (انہوں نے ظلم اور غرور کی وجہ سے ان سے انکار کردیا، حالانکہ ان کے دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔)

بڑا المیہ ہے کہ ملحدین وجود باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہش کو معبود مانتے ہیں، انہی خواہشوں کی بنیاد پر انکار خدا کرتے ہیں، قرآن نے ایسوں کی نسبت صاف کہا ہے:

﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَى عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَى بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ☆ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾ (الجاثية: ٢٣-٢٤) (کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے اور اللہ نے اس کو علم کے باوجود گمراہ کردیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگادی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا پھر اسے اللہ کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے؟ کیا تم پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے اور انہوں نے کہا کہ یہ صرف ہماری دنیوی زندگی ہے، ہم مرتے اور جیتے ہیں، ہمیں صرف زمانہ ہلاک کرتا ہے (حقیقت تو یہ ہے کہ) انہیں اس بارے میں کوئی علم وآگہی نہیں، وہ صرف خیالی باتیں کرتے ہیں۔)

الحاد کے نظریہ وفلسفہ کو سب سے زیادہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء سے تقویت پہنچی کیونکہ اس کے نظریہ میں الحاد کے نظریاتی وفلسفیانہ پہلو تھے جس نے مذاہب وادیان کے بنیادی عقائد (وجودِ باری تعالیٰ، عقیدۂ رسالت اور تصورِ آخرت) پر حملہ کیا تھا، ملحدین ومنکرین خدا کا نظریہ وتصور ہے کہ ایک مافوق الفطرت خدا کا تصور یا موجود جاننا ممکن نہیں، ملاحدہ کا طبقہ کائنات کے نظام میں کسی عظیم ہستی کی دست قدرت کی کارفرمائی کو نظرانداز کرتا ہے اور ارتقائی نظام کو کائنات کے نظم کی بنیاد مانتا ہے، خدا اور مذہب کا انکار اس لیے بھی ہے کہ مذہب بظاہر سائنس کا مخالف نظر آتا ہے اور نفس پرستی کی حوصلہ شکنی کرتا ہے، یہ استدلال بھی اصل میں غیر علمی وغیر منطقی طریقہ استدلال ہے۔

ایک امریکی سائنسداں Edward Luther Kessel نے لکھا ہے: ''غیر ارادی طور پر سائنسی تحقیقات نے ثابت کردیا ہے کہ کائنات اپنا ایک آغاز رکھتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس نے خدا کی صداقت کو ثابت کردیا ہے کیونکہ جو چیز اپنا آغاز رکھتی ہے وہ اپنے آپ شروع نہیں ہوسکتی، یقیناً وہ ایک محرک اول، ایک خالق، ایک خدا کی محتاج ہے۔'' (The Evidence of God, P:51)

George Earl Dawis ایک امریکی سائنسداں اور ماہر طبعیات ہے، وہ کہتا ہے: ''اگر کائنات خود اپنے آپ پیدا کرسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے، ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ کائنات خود ایک خدا ہے، اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تسلیم کرلیں گے لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادی بھی، میں اس طرح کے مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقیدہ کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالم مادی کی تخلیق کی ہے اور عالم کا وہ خود کوئی جزو نہیں بلکہ اس کا فرماں روا اور ناظم ومدبر ہے۔'' (أیضاً: 71)

(جاری)

مذہب اسلام کی امتیازی خصوصیات

محمد امین حسنی ندوی

اسلاموفوبیا (Islamophobia) کا لفظ مغرب نے اسلام کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کیا، یہ لفظ ۱۱؍ستمبر ۲۰۱۱ء ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ استعمال کیا گیا، ایسا لگتا تھا کہ یورپ کے سامنے اصل ہدف صرف اب اسلام بچا ہے اور حقیقتاً ایسا ہے بھی۔

برطانوی صحافی رونمیڈ ٹروسٹ کا کہنا ہے:

''اسلام ایک ایسا دین ہے جو جبر وتشدد اور دشمنی سے عبارت ہے، جو انسانیت کو خطرہ میں ڈالنے والا ہے، اسلام شدت پسندی کی باتیں کرتا ہے۔''

اسحاق بومان نے ایک جگہ لکھا ہے:

''مغربی ممالک کا اسلام سے خوف زدہ ہونا فطری ہے، اس کے کئی اسباب ہیں، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد ابتدا سے لے کر اب تک کبھی گھٹی نہیں بلکہ برابر بڑھ رہی ہے، اسلام محض چند رسمی عبادات کا نام نہیں، جو شخص اسلام لے آتا ہے وہ اس سے پھرنے کا نام ہی نہیں لیتا، تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کوئی جماعت اسلام لانے کے بعد نصرانی ہوگئی ہو۔''

اسلام کسی نسل یا ملک کا مذہب نہیں بلکہ وہ آفاقی اور عالمگیر ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (الأنبياء: ۱۰۷)

(ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔)

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً﴾ (الأعراف: ۱۵۸)

(آپ کہہ دیجیے کہ اے تمام انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔)

اسلامی نظام کی بنیاد اس علیم وخبیر کی ہدایات پر استوار کی گئی ہے جو بنی نوع انساں کا خالق بھی ہے اور اس کی نفسیات، ضرورتوں وتقاضوں سے پوری طرح آگاہ بھی ہے:

﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (الملك: ۱۴)

(کیا وہی نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا ہے، وہ تو بڑا باریک بیں اور باخبر ہے۔)

اسلام ہی تنہا وہ مذہب جس نے کمال کا بجا طور پر دعویٰ کیا ہے اور اس کے دعویٰ پر کسی کو انگشت نمائی کی جرأت نہیں ہوئی:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِيناً﴾ (المائدة: ۳)

(آج میں نے دین مکمل کردیا اور اپنی نعمت آپ پر تمام کردی اور بحیثیت دین کے اسلام کو منتخب کرلیا۔)

اسلام نے تعصب کی بیخ کنی کی ہمہ جہت تعلیم یہ کہہ کردی:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيراً وَنِسَاء﴾ (النساء: ۱)

(اے انسانو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا۔)

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۳) (اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو خاندانوں اور قبائل میں تقسیم کردیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، اللہ کے نزدیک تم میں

سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ ڈرتا ہو۔)

مساوات کا درس یہ کہہ کر دیا:

"الخلق عيال الله." (مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔)

اس نظام کے داعیوں اور اللہ کے نمائندوں نے ہمیشہ یہ صدا لگائی:

﴿وَأَنَاْ لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ﴾ (الأعراف: ٦٨)

(اور میں تمہارا خیر خواہ امانت دار ہوں۔)

اور بے لوثی کا پیغام یہ کہہ کر دیا:

﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ (سبا: ٤٧)

(میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔)

موجودہ مذاہب میں اسلام تنہا وہ مذہب جس نے صدیوں بندگان خدا کی عبادات سے لے کر معاملات تک، بین الاقوامی مسائل سے لے کر خانگی پیچیدگیوں تک کا کامیاب حل پیش کیا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنی مایہ ناز کتاب "تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات" میں لکھتے ہیں:

"اگر اقوام وملل کی زندگی اور تمدن میں نمایاں اسلامی اثرات کی تعیین وتحدید ناگزیر ہے تو ہم اختصار وانتخاب کے طور پر انھی دس بنیادی وقیمتی عطایا متعین کرنے کی کوشش کریں گے جس کا نوع انسانی کی رہنمائی، صلاح وفلاح، تعمیر وترقی میں نمایاں کردار رہا ہے، وہ اسلامی عطیات (Gift) یہ ہیں:

(۱) صاف اور واضح عقیدہ توحید۔

(۲) انسانی وحدت ومساوات کا تصور۔

(۳) انسانیت کے شرف اور انسان کی عزت وبلندی کا اعلان۔

(۴) عورت کی حیثیت عرفی کی بحالی اور اس کے حقوق کی بازیابی۔

(۵) ناامیدی، بدفالی کی تردید اور نفسیات انسانی میں حوصلہ مندی، اعتماد وافتخار کی آفرینش۔

(۶) دین ودنیا کا اجتماع اور حریف وبرسر جنگ اور انسانی طبقات کی وحدت۔

(۷) دین وعلم کے درمیان مقدس دائمی رشتہ کا قیام واستحکام اور ایک کی قسمت کو دوسرے کی قسمت سے وابستہ کر دینا، علم کی تکریم وتعظیم اور اسے بامقصد، مفید اور خدارسی کا ذریعہ بنانے کی سعی محمود۔

(۸) عقل نے دینی معاملات میں بھی کام لینے اور فائدہ اٹھانے اور انفس وآفاق میں غور وفکر کی ترغیب۔

(۹) امت اسلامیہ کو دنیا کی نگرانی اور رہنمائی، انفرادی واجتماعی اخلاق ورجحانات کے احتساب، دنیا میں انصاف کے قیام اور شہادت حق کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کرنا۔

(۱۰) عالمگیر اعتقادی اور تہذیبی وحدت کا قیام۔"

(تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، صفحہ:۲۰-۲۱)

مذکورہ بالا سطور کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا نظام حیات بننے کا دعویٰ حقیقت کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے اور اس وقت دنیا میں تنہا وہی ایک مذہب ہے جو متبادل نظام حیات کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، ذیل میں پیش کردہ دلائل کے بعد اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ اسلام ہی متبادل نظام حیات ہے اس لیے کہ اسلام دین توحید ہے:

﴿وَاعْبُدُواْ اللّهَ وَلاَ تُشْرِكُواْ بِهِ شَيْئاً﴾ (النساء: ٣٦)

(اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔)

اسلام روحانیت کا مذہب ہے:

"الاحسان أن تعبد الله كأنك تراه فالم تكن تراه فانه يراك." (صحيح البخاری)

(احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔)

اسلام اخلاق حسنہ کا معلم ہے:

﴿إِنَّ اللّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيتَاء ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاء وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ﴾ (النحل: ٩٠)

(اللہ تعالیٰ تم کو حکم کرتا ہے انصاف کا اور احسان کرنے کا اور رشتے داروں کو دینے کا اور وہ بے حیائی اور ظلم وزیادتی سے منع کرتا ہے۔)

”بعثت لأتمم مكارم الأخلاق.“

(میں اخلاق کریمانہ کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔)

اسلام عملی دین ہے:

﴿وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَى ☆وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى﴾

(النجم: ٣٩-٤٠)

(اور انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے محنت کی اور عنقریب اس کی کوشش اس کو دکھائی جائے گی۔)

﴿فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ﴾(الأنبياء: ٩٤)

(اور اس کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔)

اسلام بانی اخوت ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾

(الحجرات: ١٠)

(تمام ایمان والے بھائی بھائی ہیں اپنے بھائیوں میں صلح کراؤ)

اسلام انسان کی انسانیت کو بلند کرتا ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾

(الإسراء: ٧٠)

(بے شک ہم نے آدم کے بیٹوں کو بڑی عزت دی اور خشکی اور دریا میں ان کو سواری دی۔)

اسلام نیکی کی حمایت کو پسند کرتا ہے اور بدی کی حمایت کو ناپسند:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾

(المائدة: ٢)

(نیکی اور تقویٰ پر آپس میں تعاون کرو اور گناہ اور سرکشی میں تعاون مت کرو۔)

اسلام محبت وکرم گستری کا دین ہے:

”ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء.“

(زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔)

اسلام حکومت میں رعایا کو حصہ دار بناتا ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾(آل عمران: ١٥٩)

(اور آپس کے معاملے میں مشورہ کرو۔)

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ﴾(الشورىٰ: ٣٨)

(اور وہ آپس میں مشورہ کرتے ہیں۔)

اسلام دین تمدن ہے:

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاء رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾(الحديد: ٢٧)

(اور یہ جو رہبانیت کی بدعت انہوں نے جاری کی ہے، ہم نے انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا مگر انہوں نے اللہ کو راضی کرنے کے لیے درویشی اور فقیری کی زندگی اپنے دل سے اختیار کی مگر اس کی نگہبانی اور رعایت نہ کر سکے۔)

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾(الأعراف: ٣٢)

(آپ کہہ دیجیے اللہ کی بنائی ہوئی زینت کو اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو کس نے حرام کیا جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیں۔)

اسلام کی ان بنیادی تعلیمات کو اگر مسلمان صحیح طور سے دنیا کے سامنے پیش کرتے، پورے اعتماد کے ساتھ اور یقین کی اس کیفیت کے ساتھ جو قرن اول میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ جماعت نے پیش کیا، تو بجا طور پر تاریخ انسانی آج بھی وہی محیر العقول واقعات دیکھے گی، لیکن اس کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ یقین اور اسلام سے صحیح طور پر وابستگی خود ہمارے اندر ہو، آج ہم خود حالات کے رو میں بہکتے جا رہے ہیں، سیکولرزم کے نام پر یا کسی اور ازم کے نام پر، اصلاً ہونا یہ چاہیے کہ اسلامی زندگی کو دنیا کے سامنے ہم پیش کریں۔

تحریک ندوۃ العلماء کی جامعیت

زین العابدین ہاشمی ندوی

اس میں شبہ نہیں کہ تحریک ندوہ کو اس کے بانیوں نے جو جامعیت بخشی، اس کی بنا پر وہ اس لائق تھی اور ہے کہ ملت اسلامیہ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے، زمانہ کے حقیقی خلا کو پر کر سکے اور وقت کے خطرات اور چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی تاب لا سکے۔ تحریک ندوہ کی اصل بنیاد خالص دینی ومذہبی اور علمی وفکری تھی جس کے نزدیک مسلمانوں کی تنزلی کا واحد سبب ان کا صحیح دینی تعلیم سے بُعد تھا۔ اس تحریک میں دین وشریعت کے حامل علمائے کرام کو خصوصی مقام دیا گیا تھا، اس لیے کہ تحریک کے نزدیک امت کی حقیقی قیادت ورہبری کا فریضہ انجام دینے کی صلاحیت اسی طبقے میں تھی اور ہے۔ اس تحریک کا سب سے اہم شعار اس کا ''قدیم صالح وجدید نافع'' کا نعرہ تھا جس کی روشنی میں اس نے روز اول سے اصلاحِ نصاب کا علم بلند کیا۔ یہ تحریک تاریخ وتجربہ کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ انسانی ذہن وفکر کی تعمیر، قول وعمل کا توازن اور کردار سازی کے لیے سب سے پہلے ایک جامع ومعیاری نصاب تعلیم ونظام تربیت شرط ہے، حقیقت میں یہ وہ سانچہ ہے کہ اس کے اندر جس طرح انسان کو ڈھال دیا جائے یہ ویسا ہی ڈھل جاتا ہے۔ اس تحریک کے مقاصد کا سب سے اہم ترین وہ رکن بھی تھا جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلامی کے لیے ایک انوکھی اور دلچسپ صدا تھی یعنی ''رفع نزاع باہمی'' کا نعرہ۔

دراصل تحریک ندوہ کا مقصد ایسے عالی حوصلہ قائدین کو وجود بخشنا تھا جو ''درکف جام شریعت، درکف سندان عشق'' کا مصداق ہوں، جنہیں کتاب وسنت کا گہرا علم ہو، جن کے اندر عربی دانی کی پختہ صلاحیت ہو، جنہیں تفقہ فی الدین کا ملکہ حاصل ہو، جنہیں حالات کے نت نئے چیلنجز کو سمجھنے کا فہم ہو، جنہیں زمانے کی نبض شناسی کا ہنر ہو، جنہیں اپنے دور کی زبان وبیان سے واقفیت ہو، جن کے اندر تحمل ہو اور ان کا مزاج بھی اعتدال کا اعلیٰ نمونہ ہو، حاصل یہ کہ وہ مدرسہ نبوت کے چشمہ حیواں سے ایسے سیراب ہوئے ہوں کہ وہ اپنے قول وعمل سے زمانہ کی چول بٹھا سکیں اور اقوام عالم میں مسلمانوں کا معیار قائم کر سکیں۔

ندوۃ العلماء نے اس بات پر بھی زور دیا کہ معاصر زبانوں سے واقفیت پیدا کی جائے، معاصر مذاہب اور تہذیبوں کا مطالعہ کیا جائے، بین المذاہب سطح پر لوگوں سے گفتگو کی جائے، بلند رتبہ علماء ومبلغین ودعاۃ تیار کیے جائیں اور ایسا لٹریچر بھی لکھا جائے جو اسلام کا شارح وترجمان ہو اور اس کے ذریعہ دین کا اصل مزاج سمجھا جا سکے۔ تحریک ندوۃ العلماء نے یہ بھی طے کیا تھا کہ ان کاموں کے لیے ''اشاعت اسلام'' کا ایک شعبہ قائم کیا جائے گا، جس کی تمام اضلاع میں شاخیں ہوں گی اور ان کے تحت جگہ جگہ وعظ وارشاد کا کام کیا جائے گا اور ایسے معلمین بھی رکھے جائیں گے جو قریہ قریہ اسلامی عقائد واعمال کی تبلیغ کر سکیں اور ہندوستان میں اسلام کی جڑیں مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہو سکیں۔

تحریک ندوہ کی من جملہ ان تمام خصوصیات میں ''رفع نزاع باہمی'' کا نعرہ سب سے ممتاز ہے، جس زمانہ میں نے ندوہ نے یہ صدا لگائی اس وقت اسلامیان ہند کا مزاج ومذاق تقریباً اپنی اصل سے ہٹ چکا تھا، چند ظاہری فقہی اختلافات کو اصل دین سمجھ لیا گیا تھا، دینی مذاکرہ مجادلہ میں تبدیل ہوا، یہاں تک کہ مجادلہ سے مقاتلہ تک کی نوبت پہنچ چکی تھی، حالت یہ تھی کہ ہر فقہی مکتب فکر کا سارا زور تکفیر وتضلیل پر ہی صرف ہوتا تھا، الغرض جماعتی عصبیت اور فروعی اختلافات نے ملت اسلامیہ ہندیہ کے بدن کو زار ونزار کر رکھا تھا اور ملت کی انرجی بے ضرورت کاموں میں خرچ ہو رہی تھی۔

ندوہ کی پہلی دن سے یہی صدا ہے کہ مقصدیت پر توجہ دی جائے، دعوت کے کام میں نبوی اسالیب کو پیش نظر رکھا جائے، اعتدال اور اخلاق کے توازن کو جمع کیا جائے، زبان کو شستہ اور کردار کو شگفتہ بنایا جائے، وسائل کو مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے، کتاب وسنت اور اجماع امت کو حجت مانا جائے۔ افسوس کی بات ہے کہ جذباتیت کے اس دور میں بعض اہل علم حلقوں سے بھی ایسے ردعمل کا اظہار ہوتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تاریخ اور خصوصاً تاریخ ندوہ سے واقف نہیں۔

ہم ہیں تو خدا بھی ہے

محمد مصعب ندوی

جس زمانے سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے تب سے دنیا کے ہر حصے میں خدا کا اعتقاد موجود ہے، علم الانسان کے ماہروں نے اس پر بحث کی ہے کہ انسان جب بالکل فطری تھا یعنی تہذیب وتمدن، علوم وفنون کا بالکل بھی وجود نہیں تھا تو اس نے سب سے پہلے کس کی پرستش کی؟ کسی بت کی یا پھر خدا کی؟ تمام محققین نے یہ بات کہی ہے کہ انسان نے پہلے خدا کی پرستش کی ہے، انسانوں نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکایا تھا جب وہ خدا کا نام بھی نہ رکھ سکے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا اعتراف انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے، خدا نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ اسے ہر حال میں خدا کی خدائی کو ماننا پڑتا ہے، جب کشتی منجدھار میں ہو، بیماری جان لیوا بن جائے، یا کوئی اور مصیبت سامنے کھڑی ہو، اس وقت ہر انسان کسی اَن دیکھے سہارے کو پکارتا ہے، ہر بے سہارا مظلوم کو کسی عظیم طاقت کی جانب سے مدد کی امید ہوتی ہے۔ یہی امید، یہی احساس ربوبیت انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہ وہ فطرت ہے جس کو قرآن کریم اس انداز میں بیان کرتا ہے:

﴿وَإِذۡ أَخَذَ رَبُّكَ مِنۢ بَنِيٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَأَشۡهَدَهُمۡ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمۡ أَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡۖ قَالُواْ بَلَىٰ شَهِدۡنَآ﴾

(الأعراف: ۱۷۲)

(اور جب تمہارے پروردگار نے آدم کے بیٹوں کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو نکالا تھا اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا تھا (اور پوچھا تھا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ کیوں نہیں؟! ہم سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔)

مگر بسا اوقات یہ فطری احساس ظاہری چیزوں کی وجہ سے دب جاتا ہے، اسی لیے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ محسوس کی جانے والی چیزوں سے استدلال پیش کیا گیا ہے اور انسان سے کہا گیا کہ وہ اپنی ذات پر، نظام کائنات پر غور کرے، جب انسان اپنے وجود پر نظر کرتا ہے، زمین کی کشش اور آسمان کی بلندیوں کو دیکھتا ہے، رات اور دن، سورج اور چاند کا مشاہدہ کرتا ہے، تو بے اختیار اس کا دل پکارتا ہے، اس کا ذہن کائنات کی وسعتوں میں سوال کرتا ہے:

"وہ پوچھتا ہے کہ اے زمین! کس نے تجھ پر خاک کا فرش بچھا کر تجھ کو قسم قسم کے درختوں سے پہاڑوں سے رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ کیا ہے اور تیری چھت کو قبہ ہائے نور سے مرصع کیا ہے؟

اے پر رعب سمندر! تیری موجیں غضب ناک ہوکر زمین کو نگل جانا چاہتی ہیں، پھر کیوں تیری موجوں کا زور ایک حد سے آگے نہیں بڑھ پاتا؟ کس نے تجھ کو قید کر رکھا ہے؟

اے رات کی تاریکی! مجھے بتاؤ کس نے تجھے پرلطف بنادیا ہے۔

اے آسمانو! مجھ کو خبر دو، کس نے تجھے وسعت بخشی ہے، بغیر ستون کے تو کس قدر بلند ہے؟ کس قدر عزت مآب ہے، یقیناً تیرا کوئی خالق ہے تیرا کوئی صانع ہے۔

اے بے انتہا ستاروں! بولو وہ کس کا ہاتھ ہے جس نے تم کو افق میں تھام رکھا ہے؟

اے مہر تاباں اور آفتاب درخشاں! تم کس کی ادائے طاعت کے لیے محیط کے پردہ سے باہر نکلتے ہو اور سارے عالم پر اپنی کرنیں بکھیر کر روشنی پھیلا دیتے ہو؟

یہ سب کس کے حکم پر ہے؟ ضرور کوئی زبردست طاقت ہے جو یہ سب کروا رہی ہے، یہ زمین کی گردش، رات اور دن کا آنا جانا،

ہواؤں کا چلنا، بادلوں کا برسنا، فصلوں کا اگنا، یہ سب محض اتفاق نہیں ہوسکتا، عقل سلیم اس کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی ہے، یہ منظّم کائنات، یہ حیرت انگیز ترتیب، یہ بے مثال توازن، یہ سب بتا رہے ہیں کہ ان کے پیچھے کسی حکیم کا ارادہ کارفرما ہے، جب کسی جگہ کئی چیزیں بے ترتیب نظر آئیں تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ خود سے ہوگئی ہوں گی، مگر وہی اس ترتیب ونہایت سلیقہ سے چنی گئی ہوں کہ کوئی ماہر سے ماہر کاری گر بھی بمشکل اس طرح ترتیب دے سکتا ہے تو یہ خیال کبھی نہیں ہوگا کہ آپ سے آپ یہ چیزیں ترتیب پا گئیں، اگر کسی معمولی آدمی کو رومی کی کوئی غزل الٹ پلٹ کر پکڑا دی جائے اور کہا جائے کہ ان الفاظ کو ترتیب دو، وہ ہزاروں طرح سے کوشش کرے گا مگر ایک بار بھی اتفاقی طور پر رومی کی وہی غزل نہیں بن سکے گی جب کہ حروف وہی، الفاظ اور جملے وہی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ نظام عالم جو اس قدر مرتب وموزوں ہے وہ خود قائم ہوگیا۔

﴿صُنۡعَ اللّٰهِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ كُلَّ شَیۡءٍ﴾

(یہ خدا کی کاری گری ہے جس نے ہر شے کو خوب پختہ طور پر بنایا ہے۔)

﴿مَّا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ﴾

(خدا کی کاری گری میں تم کو کہیں فرق نظر نہیں آئے گا پھر دوبارہ دیکھو کہیں دراڑ نظر آتی ہے؟)

﴿خَلَقَ كُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِیۡرًا﴾

(خدا نے ہر شے کو پیدا کیا پھر اس کا ایک اندازہ معین کیا۔)

﴿لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ﴾

(خدا کی تخلیق میں ردوبدل ممکن نہیں۔)

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہوا کہ عالم بے نقص ہے، کامل ہے اور موزوں اور مرتب ہے، جو ایسا ہوگا وہ خود نہیں بلکہ کسی صاحب قدرت نے اس کو پیدا کیا ہوگا، جن کے دل حقیقت حال سے غافل ہیں، ان پر پردے پڑے ہیں، وہ خدا کا انکار کر بیٹھتے ہیں، یہ کوئی نیا خیال نہیں بلکہ ہر زمانے میں ایسا گروہ موجود رہا ہے جو خدا کے وجود کا یا تو منکر تھا یا شک میں رہا ہے، آج زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے، سائنس اور فلسفہ عروج پر ہے، مگر آج کے ملحدین بھی خدا کے انکار پر کوئی نئی دلیل قائم نہیں کر سکے، تمام ملحدین قدیم ہوں چاہے جدید، سب کے دلائل کا خلاصہ یہی ہے کہ خدا کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، مادہ کے سوا عالم میں اور کوئی موجود نہیں، خدا کے بغیر نظام عالم کا سلسلہ قائم ہوسکتا ہے اور ظاہر ہے یہ کوئی استدلال نہیں بلکہ عدم علم کا اعتراف ہے، متکلمین اسلام نے ملحدین کے تمام اعتراضات کو تفصیل سے نقل کیا ہے، علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب ''ملل ونحل'' میں سب اعتراضات کو نقل کر کے نہایت تفصیل سے ان کے جوابات لکھ دیئے ہیں۔

یہ تو علم الکلام کا مسئلہ ہے، آج جب کہ دنیا کے ہزاروں راز فاش ہو چکے ہیں، حقائق نے اپنے رخ سے نقاب کو ہٹا دیا ہے، بڑے بڑے حکماء اور فلاسفر نے انتہائی غور وفکر کے بعد خدا کے وجود میں وہی دلائل پیش کیے جو آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن کریم نہایت آسان، عام فہم اسلوب اور صاف طریقہ سے ادا کیا تھا۔

کیمل فلامریان لکھتے ہیں:

''تمام اساتذہ اس بات کو سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیوں کر ہوا اور کیوں کر برابر چلتا چلا جاتا ہے، اسی وجہ سے ان کو مجبوراً ایسے خالق کو ماننا پڑتا ہے جس کا مؤثر ہونا ہمیشہ اور ہر وقت قائم ہے۔''

پروفیسر لینی کہتے ہیں:

خدائے قادر و دانا اپنی عجیب وغریب کاری گریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور میں بالکل دیوانہ بنا جاتا ہوں، ہر چیز چاہے وہ کتنی چھوٹی ہو، اس میں کس قدر عجیب قدرت، کس قدر عجیب حکمت، کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے۔''

دعوت کی اہمیت اور اس کے تقاضے

محمد ارمغان بدایونی ندوی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اشیاء کے خواص کبھی نہیں بدلتے، پانی کا کام ہے پیاس بجھانا، زہر کا کام ہے ہلاک کرنا اور چاقو کا کام ہے کاٹنا۔ٹھیک اسی طرح تاریخ اقوام عالم کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں ایک چیز ہمیشہ ایسی رہی ہے جس کی تاثیر،اہمیت اور نافعیت سے کسی زمانہ میں انکار نہیں کیا گیا ہے اور وہ ہے''کارِ دعوت۔''

واقعہ یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں اس کی حیثیت آبِ حیات سے کم نہیں،اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کام میں غیر معمولی طاقت رکھی ہے،حقیقت میں یہ ایک ایسا مبارک اور غیر معمولی عمل ہے جس سے اس کائنات کی کوئی طاقت مقابلہ کرنے سے قاصر ہے،زمانہ چاہے کتنا ہی ترقی کر جائے اور انسان خواہ کتنا ہی متمدن ہو جائے لیکن دعوت کی معنی خیزی سے انکار ناممکن ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ بعض اوقات اس کے مقابلہ میں فطری اشیاء کے خواص بھی تبدیل ہو جاتے ہیں،اگر دعوت کی راہ میں آگ حائل ہو تو گل زار بن جاتی ہے،اگر سمندر حائل ہو تو راستے چھٹ جاتے ہیں،اگر چاقو یا زہر سامنے ہو تو ان کی حقیقت بھی سلب ہو جاتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر انسان کو فطری طور پر یہ اختیار دیا ہے کہ اس دنیا میں وہ خیر کی طرف مائل ہوتا ہے یا برائی کو پسند کرتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانی سماج بدعنوانیوں کا شکار ہوتا ہے، بے حیائی میں مبتلا ہوتا ہے،ظلم بڑھتا ہے اور خدا بے زاری کا ایک عام ماحول پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ خرابیاں ہیں جن کو دور کرنے کے لیے ہر دور میں اللہ نے اپنے پیغمبر بھیجے جنھوں نے انسانوں کو انسانیت کا درس دیا اور خالق کو مخلوق سے جوڑنے کا کام کیا،اخیر میں جب ظلم وستم حد سے گزر گیا اور پوری انسانی سوسائٹی ایک سڑے ہوئے لاشے کی طرح ہو گئی،تب ہادیِ عالم محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اور آپ کی آمد سے پوری دنیا کو ایک نیا رخ نصیب ہوا اور انسانیت کے تن مردہ میں ایک نئی روح دوڑ گئی۔آپ ﷺ کے بعد اصلاح وارشاد کی یہ ذمہ داری امت مسلمہ کے سپرد کر دی گئی اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ دنیا میں تمہاری بقا وخلود اور عزت وتکریم کا راز دعوت کے عمل سے وابستگی میں ہے اور اگر تم نے یہ فریضہ انجام نہ دیا یا تم غفلت کا شکار ہوئے تو یاد رکھنا کہ

﴿إِلَّا تَفۡعَلُوهُ تَكُن فِتۡنَةٞ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَفَسَادٞ كَبِيرٞ﴾

(اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہو جائے گا۔)

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس فریضہ سے ایک لمحہ کی غفلت بھی خودکشی کے مرادف ہے،روایات میں آتا ہے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے مدینہ میں حالات نارمل محسوس کیے تو اپنے بعض ذاتی امور کی طرف رخ کا ارادہ کیا لیکن اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَلَا تُلۡقُواْ بِأَيۡدِيكُمۡ إِلَى ٱلتَّهۡلُكَةِ﴾

(اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت پڑو۔)

اس میں شبہ نہیں کہ اقوام عالم کے درمیان امت مسلمہ کی بعثت کا مقصد نہ تجارت تھا نہ زراعت، نہ حرفت تھا نہ حکومت بلکہ ان کا اصل مقام ومنصب وہ داعیانہ کردار تھا جس کے ذریعہ انسانی سماج امن کا گہوارہ بنتا ہے اور خالق حقیقی کی معرفت کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔

قرآن مجید جو خاص طور پر تمام اہل ایمان کے لیے ایک راہ نما کتاب ہے، اس کے اکثر مضامین اور اس میں بیان کردہ امثال وقصص کا بنیادی موضوع یہی ہے کہ امت مسلمہ دعوت کے تئیں اپنے اندر حساسیت پیدا کرے اور اپنے منصب کو سمجھے۔

یہ بھی تنہا مذہب اسلام ہی کی خوبی ہے کہ اس نے مسلمانوں کو جس قدر دعوت سے وابستگی کی تاکید کی ہے، اتنا ہی انھیں آزاد بھی رکھا ہے، کتاب وسنت میں ہمیں دعوت کے وہ سنہرے اصول ضرور

ملتے ہیں جن کو بنیاد بنا کر ہم راہِ راست سے دور نہیں ہو سکتے لیکن مسلمانوں کو دعوت وتبلیغ کی کوئی ایک متعین ومحدود راہ کا مکلّف نہیں بنایا گیا، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ زمان ومکان کے تغیر سے ہر دور میں لوگوں کے مزاج ومذاق میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے، ایسی صورت میں اگر کسی ایک ہی طریقہ کا مکلّف بنایا جاتا تو شاید دشواریاں ہوتیں، اسی لیے کتاب وسنت میں چند بنیادی اصول ہی پر اکتفا کیا گیا ہے جو یقیناً رہتی دنیا تک کے لیے بھرپور اور کافی ہیں۔

دعوت کا دائرہ نہ تقریر وتحریر میں محدود ہے، نہ وعظ وتذکیر میں، نہ مدرسہ کی چہار دیواری میں اور نہ تبلیغ کی موجودہ شکلوں میں، نہ تنظیموں میں اور نہ جماعتوں میں، بلاشبہ یہ سب چیزیں دعوت کے وسائل، دین کی خادم اور وقت کی ایک ضرورت ہیں، تاہم دعوت دین کے یہی طریقے نہیں ہیں بلکہ قرآنی اصول کی روشنی میں اس سلسلہ میں زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ مختلف شکلیں اختیار کی جاتی رہیں گی۔

دعوت کے سلسلہ میں سب سے بنیادی بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾(النحل: ۱۲۵)

(اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاتے رہیے اور اچھے طریقہ پر ان سے بحث کیجیے۔)

دعوت کا یہ وہ بنیادی اصول ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام اور بطور خاص حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ دراصل دانش مندی، موقع شناسی ومزاج شناسی اور حسن کردار وگفتار وہ جوہر ہے جو مخاطب کی نفسیات پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے، اسی لیے مسلمانوں سے یہ مطالبہ ہے کہ ان کا طرز زندگی بجائے خود ایسا دیدہ زیب ہونا چاہیے جو غیر شعوری طور پر ذہنوں کو اپیل کرتا ہو۔ اس کے علاوہ موعظہ حسنہ کا زریں اصول بھی ہر دور میں مسلم رہا ہے اور بعض اوقات ایک وعظ پوری قوم کی تقدیر بدلنے کا سبب بنا ہے، تاہم کچھ جگہوں پر جدال مگر وہ بھی احسن اسلوب میں مفید ہوتا ہے، جدال میں احسن کی شرط یہ پیغام دیتی ہے کہ ایک مسلمان کو ہر حال میں اپنے شعور وجذبات پر قابو رکھنا مطلوب ہے اور بیدار مغزی کے ساتھ اس فریضہ کو ادا کرنا ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام محض نقوش اور رسمی خطوط پر نہیں ہوتا بلکہ کارِ دعوت کے لیے دل کے اندر ایک تڑپ اور کڑھن بھی ضروری ہے۔ ایک داعی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مذہب اسلام پر اسے پوری طرح انشراح ہو اور اس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر آواز اور پرفریب نعرہ اس کے لیے بے حیثیت ہو، اسی لیے قرآن مجید میں بار بار یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ ہر داعی کو انسانیت کے حق میں خیر خواہ اور امانت دار ہونا ناگزیر ہے۔ دعوت کے کام میں نرم مزاجی کی بھی بڑی اہمیت ہے، فرعون جیسے ظالم وجابر کے دربار میں جانے سے پہلے خصوصیت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وصف کی تلقین کی گئی اور اس میں کیا شبہ ہے کہ حضور ﷺ کی زندگی کا تو یہ امتیازی وصف تھا۔ دعوت کے میدان میں جذباتیت سے دور، صبر واستقامت کے وصف سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ حالات اور اپنے مخاطبین کی نفسیات اور ان کی ضروریات کا بھی علم ہونا چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دعوت کے کام میں بڑے منافع پوشیدہ رکھے ہیں، اگر یہ کام کوئی فرد انجام دے تو اسے محبوبیت عطا ہوتی ہے تاہم اگر یہ فریضہ من حیث القوم انجام دیا جائے تو دنیا کی تمام قومیں اس کو اپنے سر کا تاج سمجھتی ہیں۔ یہی وہ مبارک کام ہے جو سماج سے برائیوں کا خاتمہ کرتا ہے، زندگی کو پرسکون بناتا ہے، انسانوں کے مابین رشتوں کو مضبوط کرتا ہے، ظلم وستم کو دور کرتا ہے، بدعنوانیوں پر روک لگاتا ہے اور ایک مثالی انسانی سماج کو وجود بخشتا ہے۔ یہ وہ اہم کام ہے جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہے، سچی بات یہ ہے کہ آج دنیا کی تمام قومیں امن کی متلاشی ہیں، ایک سچی اور اچھی زندگی کی خواہاں ہیں مگر وہ تہی دامن ہیں، وہ تمام تر ترقیات، ایجادات واکتشافات اور زر ودولت کی فراوانی کے باوجود اس متاع عظیم سے محروم ہیں لیکن مسلمان اس دولت سے مالا مال ہیں اور اس سلسلہ میں پوری طرح سے خود کفیل بھی، خدا کرے کہ ان میں اپنے مقام ومنصب کی بیداری کی لہر پیدا ہو اور وہ اخلاص وخیر خواہی کے ساتھ اس میدان میں آگے بڑھ کر انسانیت کو نجات کا راستہ عطا کریں۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک لائحۂ عمل

فکر بوالحسن کی روشنی میں

مولانا جعفر مسعود حسنی ندویؒ

’’ہندوستان کی یہ خاصیت رہی ہے کہ یہاں جو قوم آئی وہ ضم ہوگئی، جو تہذیب آئی وہ مٹ گئی، اسی وجہ سے ہندوستان کو ’’اکال الامم‘‘ کہا جاتا ہے، یہ سرزمین قوموں اور تہذیبوں کا مدفن رہی ہے، ایسے ملک میں مسلمان اپنے ملی تشخص اور دینی امتیاز کے ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں؟! اس کے لیے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے چار چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے:

(۱) مکاتب کا قیام تاکہ دین نئی نسلوں تک منتقل ہوتا رہے۔

(۲) تحریک اصلاح معاشرہ تاکہ مسلمانوں کو ان مشرکانہ رسم ورواج سے بچایا جاسکے جو غیر مسلموں سے اختلاط کی وجہ سے ان میں سرایت کرتے جارہے ہیں۔

(۳) مسلم پرسنل لا کی حفاظت تاکہ شرعی عائلی قوانین میں حکومت کی دخل اندازی کو روکا جاسکے اور مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے سارے مسائل اور معاملات شرعی قوانین کے مطابق حل کریں۔

(۴) تحریک پیام انسانیت جس کا مقصد غیر مسلموں کے ذہنوں کو صاف کرنا، انسانیت کے احترام کی بات کرنا، انسانی قدروں کو فروغ دینا، انسان کو اس کا مقام ومرتبہ یاد دلانا اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات کا ازالہ کر کے ماحول کو پرامن بنانے کی کوشش کرنا۔

حضرت مولاناؒ ان چار کاموں کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور عملی طور پر ان کاموں میں بھرپور حصہ لیتے تھے، دینی تعلیمی کونسل ہو، یا مسلم پرسنل لا بورڈ ہو، یا اصلاح معاشرہ کی تحریک ہو، یا پیام انسانیت کا مشن! حضرت مولاناؒ ان سب کے داعی نہیں، روح رواں تھے۔

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 18 ⚜ January 2026 ⚜ Issue: 01

سید احمد شہید اکیڈمی کی پیشکش

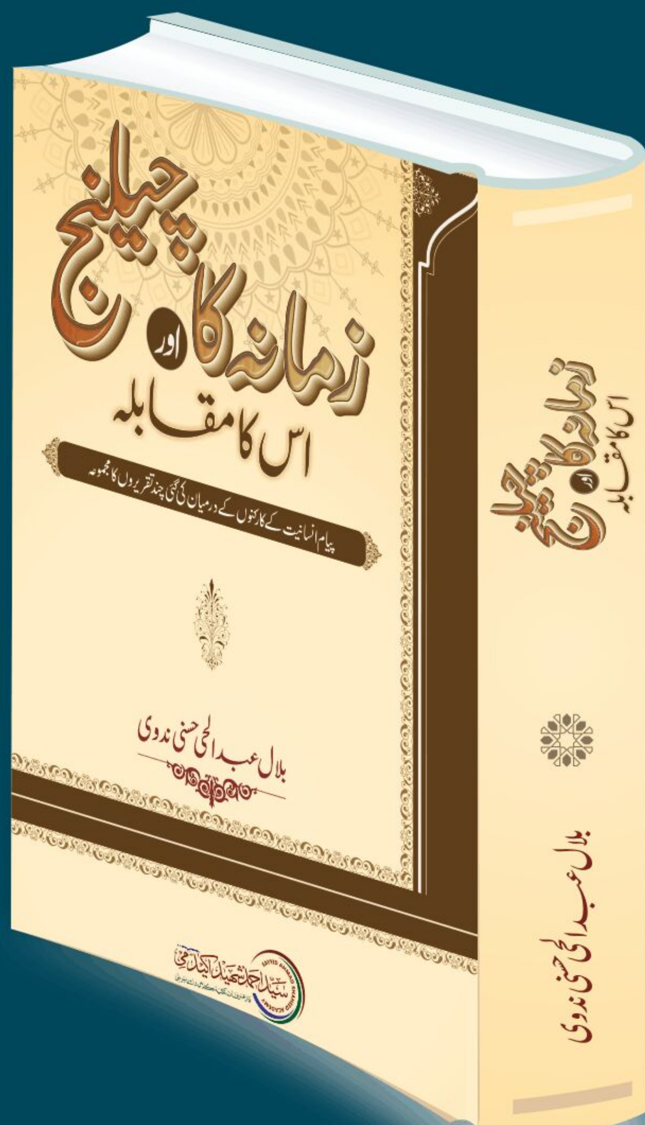

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9792646858
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)